غلام گردش)

کالج، جھیل اور تربیلا

موٹروے سے صرف پچیس تیس منٹ کی مسافت پر تربیلا ڈیم سے متصل علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ جہان حیرت ہے۔ ایک ایسی سرزمین جسکو قدرت نے اپنے ہاتھوں سے ترتیب دیا ہے۔ دو دن پہلے شام کو وہاں پہنچا تو اندھیرہ آہستہ آہستہ خیمہ زن ہو رہا تھا۔ روشنی کم ہو چکی تھی۔ ریسٹ ہاؤس پہنچا تو تبرگی سب کچھ لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اسکے باوجود جھیل کے بالکل نزدیک کرسی پر بیٹھا رہا۔ سردی شدت کی تھی۔ مگر خاموش پانی بھی اپنے جوبن پر موجود تھا۔ یک دم احساس ہوا کہ ہر طرف مکمل خاموشی ہے۔ دور دور تک کسی قسم کا کوئی شور نہیں۔ اجنبی سی خاموشی میرے ذہن میں سرایت کرنے لگ گئی۔ کافی دیر نظر نہ آنے والے پانی کو دیکھتا رہا۔ لاہور جیسے بڑے شہر میں رہنے کی بدولت خاموشی کا احساس تو کب کا ذہن سے نکل چکا۔ یہاں تو بے ہنگم ٹریفک کے شور سے لیکر جلسے جلوسوں اور انسانوں کا جان لیوا شور ہی شور ہے۔ مگر ہر طرف خاموشی کا طاقتور شور انسان کے ذہنی دریچوں کو کھول دیتا ہے۔ کبھی کبھی اسکی ملاقات خود اپنے آپ سے ہو جاتی ہے۔ صاحبان! دنیا میں سب سے مشکل ملاقات اپنے آپ سے ہی ہوتی ہے۔ وقت کے سفر نے جو زخم آپکی روح پر لگائے ہوتے ہیں، یک دم ہرے ہو کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خاموشی اور سردی سے لبریز واپس ریسٹ ہاؤس آ گیا۔

دراصل کیڈٹ کالج تربیلا کی سالانہ تقریب تھی۔ کالج کے پرنسپل ملک آصف کو انکار اسلیے نہیں کیا جا سکتا کہ حسن ابدال میں میرے استاد رہے ہیں۔ یہ صرف چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ویسے ملک آصف جیسے رعب دار استاد کو ویسے ہی انکار کرنا ناممکن ہے۔ تعلیم کے شعبہ میں وہ معدودے چند اساتذہ میں سے ہیں جنہیں بورڈنگ سکول چلانے کا وسیع تجربہ ہے۔ اگلے دن وقت مقررہ پر کالج پہنچا تو انتہائی دلفریب نظارہ تھا۔ چاک و چوبند عملہ مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ کسی قسم کی کوئی بھگ دھڑ نہیں تھی۔ نظم وضبط کا یہ مظاہرہ آج کے پاکستان میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ویسے ہی ہمارا دیس مکمل طور پر بے ترتیبی اور انتشار کا شکار ہے۔ جو کسر تھی وہ سیاسی پہلوانوں کے دنگل نے پوری کر دی ہے۔ ہر فریق بلند آواز میں دست وگریباں ہے۔ معقول اور مہذب سیاست، اول تو اس خطے میں تھی ہی نہیں مگر اب تھوڑا سا بھرم بھی رخصت ہو چکا۔ بدنظمی کے اکھاڑے کے جگادریوں کو کیڈٹ کالج تربیلا کے نوجوانوں سے ڈسپلن کی ٹریننگ لینی چاہیے۔ میرا خیال ہے چھٹیوں میں آصف صاحب کو کوئی خصوصی کورس ترتیب دینا چاہیے تاکہ طاقتور لوگوں میں تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا تھوڑا سا سبق سکھا سکیں۔ یا شائد! اب سرجری کی ضرورت ہے۔ معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ پنڈال میں پہنچا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ سینکڑوں مرد اور خواتین بڑے آرام سے مہمان خصوصی کا انتظار کر رہے تھے۔ پنڈال کے بالکل سامنے گراؤنڈ میں پریڈ کیلیے تیار، چاروں ہوسٹلز کے نوجوان خاکی یونیفارم میں ایستادہ تھے۔ ڈائس کے اردگرد نوجوان بتوں کی طرح موجود تھے۔ مہمان خصوصی چیئرمین واپڈا جنرل مزمل تھے۔ جب سے مزمل صاحب واپڈا کے چیئرمین بنے ہیں، پورے ادارے میں حرکت اور ہلچل کا طوفان سا مچ چکا ہے۔ یہ صرف چار پانچ ماہ سے اس عہدے پر آئے ہیں۔ انتہائی متحرک اور قوت فیصلہ سے مالا مال انسان۔ جنرل مزمل کے آنے سے واپڈا میں

ہر کام غیر معمولی رفتار سے ہونے لگا ہے۔ خیر تقریب کا آغاز ہوا۔ تلاوت مسحور کن تھی۔ ترجمے کی روایت نے اب اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔ یہ "پیرنٹس ڈے" (Parents Day) تھا، لہذا مناسبت سے والدین کے ذکر سے بھرپور آیتیں کمال تھیں۔ اپنے والدین سے اچھا سلوک کرو۔ ان پر مہربانی کرو بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے تمہارے اوپر کی ہیں۔ بخدا یہ قطعاً معمولی بات نہیں ہے۔ ایک سبق ہے جو چودہ سو برس پہلے خدا نے قرآن حکیم کی بدولت نازل کیا تھا۔ کمال خوبصورت بات ہے، کمال خوبصورت!

گارڈ آف آنر سے لیکر پریڈ انتہائی منظّم اور خوبصورت تھی۔ روایتی پریڈ جو ہرگز ہرگز آسان نہیں ہے، تربیت کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق تھی۔ دیکھنے والوں کو قطعاً اندازہ نہیں ہوتا کہ پندرہ بیس منٹ کی پریڈ کے پیچھے کتنی جفاکش محنت بلکہ ریاضت موجود ہے۔ کم از کم تین سے چار ماہ کی مسلسل ٹریننگ کی بدولت یہ نوجوان ہمارے سامنے خاکی یونیفارم پہنے خیرہ کن پریڈ کر رہے تھے۔ مسلسل سوچ رہا تھا کہ ہم میں سے اکثریت نوجوانی میں ڈسپلن کے عادی ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے سکول میں نظم وضبط کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے، پھر آخر بڑے ہو کر ہم اتنے تبدیل کیوں ہو جاتے ہیں۔ اتنے بگڑ کیوں جاتے ہیں۔ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس قدر رنگ آلود کیونکر ہو جاتے ہیں۔ شائد عملی زندگی اس درجہ منفی ہے کہ اس میں معیاری خواص کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ شائد مسئلہ ہی یہی ہے۔ پریڈ کے بعد ایک اعلیٰ معیار کا پی ٹی شو تھا۔ انتہائی مشق کے بعد یہ پی ٹی شو بھی کمال تھا۔ بچے جس طرح ہوا میں قلابازیاں کھا رہے تھے، آگ کے دائرے میں سے اڑتے ہوئے نکل رہے تھے، ایسے لگتا تھا کہ انکے جسم میں کوئی ہڈی موجود نہیں ہے۔ پی ٹی کے اعلیٰ میعار سے پتہ چلتا تھا کہ ادارے نے جسمانی تربیت کیلئے بہترین کوچ رکھے ہوئے ہیں۔ ویسے تو اس پوری قوم کو پی ٹی کروانے کی ضرورت ہے۔ شائد میں غلط لکھ رہا ہوں۔ بیس کے بیس کروڑ لوگ ہر وقت پی ٹی کر رہے ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ غلط ترتیب سے کر رہے ہیں۔ جہاں ہمیں چھلانگ لگانی چاہیے، ہم سارے لیٹ جاتے ہیں۔ جہاں قلابازی کی ضرورت ہے وہاں ہم ساکت ہو جاتے ہیں۔ جہاں آگ کے دائرے میں سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے، ہم اس میں سے تیزی سے نکلنے کی بجائے، دائرے ہی سے دور بھاگ جاتے ہیں۔ محنت، علم اور یگانگت کے آتشی دائرے سے ہم ویسے ہی گھبراتے ہیں۔ اسکے نزدیک تک نہیں جاتے۔ خیال ہے ساٹھ سال سے ہم نے اپنے کوچ صحیح طور پر منتخب نہیں کیے۔ ہم جسے بھی اپنا کوچ بناتے ہیں، وہ ہمیں پی ٹی پر لگا کر ایسے پروفیشنل طریقے سے لوٹ مار کرتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ دراصل ہو کیا رہا ہے۔ آج کے دور میں بدعنوانی ایک آرٹ بن چکی ہے۔ جو جتنا زیادہ کرپٹ ہے، وہ اتنا ہی زیادہ معصوم اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہمیں قومی طور پر ایک درجن سے زیادہ ایماندار قومی پی ٹی ماسٹر چاہییں تاکہ ہم لوگ تربیلا کے کیڈٹ کالج کی پی ٹی سے کچھ سیکھ سکیں۔

تقسیم انعامات کی تقریب بھی خوب تھی۔ بچے انتہائی اعتماد سے ڈائس پر آتے تھے۔ انعام وصول کرتے تھے اور قرینے سے واپس چلے جاتے تھے۔ کسی قسم کی بے ترتیبی نظر نہیں آئی۔ پنڈال میں بچوں کے والدین عزیز و اقارب اور اساتذہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کسی کا لختِ جگر انعام وصول کر رہا ہوتا تھا تو والدین بڑے فخر سے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمانوں کو بتاتے تھے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ تجسس تھا کہ زیادہ انعام پانے والے بچوں کا ذاتی ردِعمل کیا ہوگا۔ اَز حد خوشی ہوئی جب دیکھا کہ ایک بچہ بہت سے انعام لیکر پنڈال میں بیٹھے ہوئے والدین

کے پاس گیا۔اس نے تمام انعامات والدہ کی جھولی میں ڈال دیے۔والدہ نے کھڑے ہوکر اپنے بیٹے کا ماتھا چوما۔شاندار منظر بہت عرصے کے بعد نظر آیا۔یہ خالص جذبات ہیں جو آج کل کے مصنوعی دور میں صرف ٹی وی ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ویسے ہمارے ڈرامے اس درجہ ادنیٰ ہو چکے ہیں کہ خدا کی پناہ۔مگر پھر بھی لوگ انہیں دیکھتے ہیں۔اصل میں ہم تمام لوگ ہر شعبہ میں ادنیٰ کارکردگی کے عادی بنائے جا چکے ہیں۔سیاست سے لیکر کھیل کے میدان تک، ہر طرف تیسرے درجے کے لوگ ہم پر مسلط کر دیے گئے ہیں۔دعویٰ ہے کہ سب کچھ میرٹ پر ہو رہا ہے۔اگر سب کچھ عدل پر ہے تو ہم دنیا کی قوموں میں اتنے پسماندہ کیوں ہیں۔آنے والے دنوں میں ہمارے حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں۔خیر ماں کیلئے تو بچے کو ملنے والے انعامات ان تمام تکالیف کا مداوہ ہیں جو اولاد کو پروان چڑھانے میں بسر کیے ہیں۔یہ دراصل محنت کش مائیں ہی ہیں، جنکی بدولت قومیں چلنا سیکھتی ہیں۔میدان عمل میں دوڑنا سیکھتی ہیں۔

پنڈال میں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔مگر اس تقریب نے موسم کو بھی بے اثر کر دیا۔پرنسپل صاحب نے تقریر میں گزشتہ تعلیمی سال میں ہونے والے امتحانات کا تنقیدی جائزہ لیا۔سکول کے بچوں کی علمی کارکردگی پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔اَمر خوشگوار تھا کہ اس ادارے کے بچے تعلیمی میدان میں بھی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔آخری تقریر جنرل مزمل کی تھی۔میرا خیال تھا کہ ایک لکھی لکھائی تقریر پڑھ دینگے۔یا پھر فوجی انداز سے گفتگو شروع کر دینگے۔مگر مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے لکھی لکھائی تقریر کو ایک طرف رکھ کر انتہائی شائستہ اردو میں تقریر شروع کر دی۔تقریر نہیں تھی بلکہ دل کی باتیں تھیں جو بچوں اور والدین سے کرنا چاہتے تھے۔باقی ساری باتیں ایک طرف، مگر ایک اہم نکتہ بار بار اُٹھایا گیا۔وہ تھا کہ ہم تعلیم تو دے ہی دیتے ہیں مگر اصل کام بچوں کی بہتر تربیت کرنا ہے۔یہ نکتہ باریک بھی ہے اور غور طلب بھی۔اگر اچھی تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت نہ ہو تو بہترین تعلیم بھی بیکار ہو جاتی ہے۔تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ، پر تربیت کا واقعی کوئی متبادل نہیں ہے۔ہم میں سے اکثریت بچوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلواتے ہیں، انکو پاکستان اور غیر ممالک کی بہترین درسگاہوں میں داخلہ دلواتے ہیں۔اپنے تئیں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض پورا کر لیا۔مگر نہیں، اصل نکھار تو اچھی تربیت سے آتا ہے۔ہمارا یہ جزو بہت کمزور ہے۔اس پر اَز حد توجہ دینے کی ضرورت ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ ایک بہترین نکتہ ہے۔

تقریب سے واپسی پر ریسٹ ہاؤس آیا اور جھیل کے کنارے بیٹھ گیا۔جہاں تک نظر جاتی تھی پانی ہی پانی تھا۔دن کی روشنی میں پانی کے مختلف رنگ نظر آ رہے تھے۔نیلا، اودی، فیروزی اور بے رنگ۔معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی اور ہی دنیا کی جھیل ہے۔خاموش، اجنبی اور رنگ دار۔واپسی پر دیکھا کہ طلباء کی اکثریت گھروں کو روانہ تھی۔اپنا اپنا سامان اٹھائے ہوئے پیاروں کی طرف گامزن۔دل چاہ رہا تھا کہ گاڑی سے اتر کر ایک قلی بن جاؤں۔ان معصوم بچوں کا بوجھ اپنے سر پر اُٹھا کر انہیں منزل تک چھوڑ کر آؤں۔صرف اسلیے کہ ہمارے مستقبل کا تمام بوجھ ان بچوں نے اپنے سر پر خود اُٹھانا ہے۔یہ ہمارا آنے والا کل ہیں۔ہمیں آج انکا بوجھ اُٹھانے کی ہمت کرنی چاہیے!

راؤ منظر حیات